ذہنیت کی ترجمانی کرتے ہیں، اس وقت تک مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور ان کی مستقل قومی تہذیب فنا نہیں ہوسکتی، اور نہ وہ اس لٹریچر سے بیگانہ ہوسکتے ہیں جو ان کے ذہن میں اس قومیت اور اس تہذیب کی قدروقیمت پیدا کرتا ہے۔ اس حقیقت سے بے خبری نہیں بلکہ کامل باخبری ہی ان کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ زبان میں "علیحدگی پسندی" کے رجحان کو "فرقہ پرستی" جیسے گھناؤنے القاب سے یاد کر کے آزادی پسند مسلمانوں میں اس کے خلاف نفرت پیدا کریں، اس لیے کہ دراصل ان کا نصب العین ہندوستان کی تمام آبادی کو "ایک قوم" بنانا، اور جدا جدا قومیتوں کو فنا کردینا ہے۔ ان کے نزدیک "سیاسی رجعت پسندی" یہ ہے کہ اس ملک کی کوئی قوم اپنی مستقل قومیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرے اور "سیاسی ترقی پسندی" یہ ہے کہ سب قوموں کے لوگ اپنی اپنی قومیتوں کو چھوڑ کر اس "ایک قوم" میں جذب ہوجائیں جسے پنڈت جی وجود میں لانا چاہتے ہیں۔ اس قسم کی متحدہ قومیت پیدا کرنے کے لیے منجملہ دوسری تدابیر کے ایک یہ تدبیر بھی ضروری ہے کہ ایک "مشترک قومی زبان" پیدا کی جائے، اور ہر ایسی زبان کو مٹادینے یا کم از کم مسخ کردینے کی کوشش کی جائے جو کسی قوم کی جداگانہ قومیت کو سہارا دیتی ہے۔

یہی نصب العین ہے جس کو پیش نظر رکھ کر "ہندوستانی زبان" کا پروپیگنڈا کیا جارہا ہے۔ آخری منزل مقصود پنڈت جی کے نزدیک بھی یہی ہے کہ زبان اور رسم الخط دونوں میں "علیحدگی پسندی" کے رجحان کو مٹادیا جائے لیکن وہ اپنے ہم مشربوں سے زیادہ ہوشیار ہیں، اس لیے کہتے ہیں کہ تدریج کے ساتھ ایک ایک قدم بڑھاؤ۔ دفعتاً رسم الخط پر ہاتھ ڈالو گے تو شکار ہاتھ سے نکل جائے گا۔ لہٰذا سردست اس کی حفاظت کا اطمینان دلادو، اور پہلے الفاظ و اسالیب بیان میں "علیحدگی پسندی" کا رجحان دور کرنے کی کوشش کرو۔ جب اردو زبان عربی و فارسی الفاظ کے ذخیروں سے خالی ہوکر ہندی الفاظ سے بھرپور ہوجائیگی، جب ذخیرۂ الفاظ کے بدلنے سے اسالیب بیان، اور خود حقیقت بیان میں تغیر پیدا

ہو جائیگا، تو سمجھ لو کہ آدھا معرکہ سر ہوگیا۔ اس کے بعد دیکھیں گے مستقبل نے اگر کوئی مناسب موقع فراہم کر دیا تو رسم الخط میں بھی "علیٰحدگی پسندی" کا رجحان مٹا دیا جائیگا، اور "مشترک قومی زبان" کی تخلیق پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گی ــــ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ دانشمندانہ پالیسی اور کیا ہوسکتی ہے۔ اسی بنا پر پنڈت جی فرماتے ہیں :ــــ

"اس لیے دانشمندی کے ساتھ ہم نے اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ دونوں (رسم الخطوں) کو پوری آزادی حاصل رہے۔ اگرچہ یہ ان لوگوں پر ایک مزید بار ہوگا جنہیں دونوں کو سیکھنا پڑے گا اور یہ ایک حد تک علیٰحدگی پسندی کے لیے بھی مددگار ہوگا۔ مگر ہمیں انہی نقصانات کے ساتھ کام کرنا پڑیگا کیونکہ ہمارے لیے کوئی دوسرا راستہ کھلا ہوا نہیں ہے ...... مستقبل ہمارے لیے کیا کچھ لائیگا اس کی مجھے خبر نہیں، مگر سر دست دونوں کو باقی رہنا چاہیے" (پنڈت جی کا مذکورہ بالا مضمون)

"میں اس امر میں کوئی شک وشبہ نہیں رکھتا کہ ہندی اور اردو دونوں ایک دوسرے کے قریب آکر رہیں گی ــــ خواہ یہ دونوں مختلف لباس پہنے رہیں، مگر اپنے جوہر اور روح کے اعتبار سے ایک ہی زبان ہوں گی۔ جو قوتیں اس وحدت کی تائید کر رہی ہیں وہ اسقدر طاقتور ہیں کہ افراد ان کی مزاحمت نہیں کرسکتے۔ یہاں قوم پرستی ہے اور ایک ہندوستان دیکھنے کی خواہش عام طور پر پھیلی ہوئی ہے۔ اسی کی فتح ہو کر رہے گی ...... اگرچہ ہم خوشی کے ساتھ اس علیحدگی کو برداشت کریں گے جو اس وقت قائم ہے، مگر ہم کو وحدت قائم کرنے والے اس عمل میں مدد دینی چاہیے"۔ (مضمون مذکور)۔

یہاں آکر پنڈت جواہر لال اور مہاتما گاندھی کے راستے مل جاتے ہیں۔ اگرچہ پنڈت جی علیٰحدگی کے رجحان کو سخت قابل نفرت سمجھتے ہیں، اور مہاتما جی کے طرز عمل میں علیٰحدگی پسندی کا یہ رجحان بالکل

نمایاں ہے، اس بنا پر پنڈت جی کو مہاتما جی سے نہ صرف اختلاف کرنا چاہیے تھا بلکہ انہیں "فرقہ پرست" اور سیاسی رجعت پسند" کہنا چاہیے تھا، مگر چونکہ مقصد دونوں کا ایک ہے، اور دونوں ایک ہی منزل مقصود کی طرف دو علیحدہ راستوں سے چل کر ایک مقام پر مل جاتے ہیں اس لیے دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو کھرچنے کی ضرورت نہیں سمجھتا بلکہ پنڈت جی مہاتما جی کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ کم سمجھ لوگ خود گاندھی جی کو اُس چیز کا مجرم ٹھیراتے ہیں جس کے خلاف انہوں نے اپنا پورا زور لگا دیا ہے"(جامعہ مورخہ اکتوبر ۱۹۳۶ء ص ۹۰۳)۔

کھلی ہوئی "فرقہ پرستی" کے مقابلہ میں "قوم پرستی" زیادہ کامیاب چیز ہے۔ آپ علانیہ پرندوں کے سامنے جال پھیلائیں گے تو چند بے وقوف پرندوں کے سوا کوئی اس میں نہ پھنسیگا۔ دام ہمرنگ زمین ہونا چاہیے، دانہ بکھرا ہوا ہونا چاہیے، اور ایک ہوشیار شکاری جو پرندوں کی ذہنیت سے خوب واقف ہو آپ کی مدد پر ہونا چاہیے تاکہ وہ ہر طرف سے گھیر گھیر کر پرندوں کو دام کے پاس لائے۔ پھر دیکھیے پرندوں کے رب النوع تک جال میں پھنسے ہوئے نظر آئیں گے۔ ہندوستان کی مشترک فلاح و بہبود کا نام لے کر "قومیت" کا جال بچھائیے۔ اس پر سیاسی ترقی اور معاشی خوشحالی کا دانہ پھیلائیے۔ اور ایک نقیب چھوڑ دیجیے جو اطراف و نواح میں اعلان کرتا پھرے کہ جو پرندہ اس جال کی طرف نہ آئے گا وہ فرقہ پرست اور سیاسی رجعت پسند قرار دیا جائیگا اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا جائے کہ ہمارے سامنے اس وقت سب سے بڑا سوال ہندوستان کے افلاس اور بے روزگاری کا ہے اور یہ دانہ جو بکھرا ہوا ہے (نیچے بچھے ہوئے جال کا ذکر نہ کیجیے) اسی سوال کو حل کرنے کے لیے بکھیرا گیا ہے۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ جھنڈ کے جھنڈ آپ کی طرف آئیں گے اور اس طرح آپ کے جال پر گریں گے جیسے شمع پر پروانے گرتے ہیں۔

مشترک ہندوستانی قومیت کی تخلیق کے لیے اردو کو ہندی کے ساتھ ملانے کی جو تحریک زور شور کے ساتھ پھیلائی جا رہی ہے اس کا اثر یہ ہے کہ اردو برابر ہندی کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے، اردو

تحریروں میں روز بروز ہندی الفاظ کا اضافہ ہو رہا ہے، اور ہمارے علمائے کرام تک عربی و فارسی کے الفاظ کو نکال کر ہندی الفاظ اردو میں استعمال کرنے کی نہ صرف حمایت بلکہ تاکید فرما رہے ہیں، اگر ہندی ادب میں اردو کی طرف قدم بڑھانے کا ادنیٰ امیلان تک نہیں پایا جاتا۔ اس کی بہترین شہادت سندر لال جی الٰہ آبادی کا وہ خط ہے جو انہوں نے ۲۴ ستمبر ۱۹۳۶ء کو گاندھی جی کے نام لکھا تھا۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"اردو رسالوں میں ودوان (عالم) مسلمان مصنفوں کے لیکھ اس مضمون کے برابر نکلتے رہتے ہیں کہ ہمیں اردو سے عربی اور فارسی کے غیر مانوس شبدوں کو نکال کر ہندی کے عام فہم شبدوں کا استعمال کرنا چاہیے۔ ایک مسلم اردو رسالہ کی زبان پر کسی کٹر مسلمان نے اعتراض کیا۔ آپ کو تعجب ہوگا، ودوان (عالم) ایڈیٹر نے جواب دیا کہ میں حجازی اردو سے اپنے رسالے کو ناپاک نہیں کرنا چاہتا۔ اس چیز پر عمل بھی جتنی کامیابی کے ساتھ آج کل اردو رسالوں میں ہو رہا ہے کسی ہندی رسالہ میں نہیں ہو رہا ہے۔ لاہور کے رسالہ نیرنگ خیال سے میں نے اردو نظم و نثر کے چند نمونے اپنے دکھن بھارت ہندی پرچار سبھا کے کانووکیشن ایڈریس میں نقل کیے تھے جنہیں اگر آپ جوں کا توں ناگری حرفوں میں کسی ہندی رسالے میں شائع کرا دیں تو کسی بھی پڑھنے والے کو یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ اردو سے لیے گئے ہیں۔ یہ سب مسلمانوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ مجھے شک ہے کہ کسی ہندی رسالے سے شائد کوئی ایک نمونہ بھی ایسا نہیں نکالا جا سکتا......

آپ خود کسی وقت آئندہ کی ہندوستانی زبان کے لحاظ سے سندر ملی جلی زبان بولا کرتے تھے کہ جسے سن کر اردو داں اور ہندی داں دونوں کا دل خوش ہو جاتا تھا۔ دونوں سمجھتے تھے۔ لیکن ناگپور کی جو آپ کی تقریر جوں کی توں دلی کے جامعہ میں چھپی ہے"

وہ چیز نہیں ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی جیسے وودان جنہوں نے اپنی یوم النبی کی چھپی ہوئی تقریر میں بجائے حضرت محمدؐ کے سوامی محمدؐ لکھا ہے برسوں سے زوروں کے ساتھ کھلے طور پر کوشش کر رہے ہیں کہ ہمیں نہ صرف اردو کو سہل ہندوستانی بنانا چاہیے بلکہ اردو کی جگہ اسے ہندوستانی کہنا چاہیئے"۔ (رسالہ "جامعہ" مورخہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ء ص ۸۷ - ۸۸۶)

یہ اقتباس کسی تبصرے کا محتاج نہیں ہے۔ اس کو پڑھ کر وہ تصویر خود بخود آپکے سامنے مکمل ہوجاتی ہے جسے میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ ایک طرف "قوم پرست" اس ملک کی آبادی کو "ایک قوم" بنانے کی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں، اور دوسری طرف ہمارے نیک دل بھائی ابھی تک اسی بھول بھلیاں میں چکر لگا رہے ہیں کہ اردو کو اپنے "طاقت ور دلائل" اور اپنے عمل سے ہندوستان کی مشترک زبان ثابت کردیں۔ یہ حضرات اردو کی تاریخ پر عالمانہ مقالات لکھ رہے ہیں حالانکہ "قوم پرستوں" کو ان مقالات میں صرف ایک ہی کام کی بات ملتی ہے، یعنی یہ کہ اردو کوئی الگ زبان نہیں ہے بلکہ یہی ہندی ہے جس کے مفہوم میں شبلی اور شام سندر داس دونوں کی تحریریں آجاتی ہیں۔ یہ حضرات آدھے رستے پر ملنے (Meeting half ways) کا طریقہ اختیار کرکے اردو کو نیم ہندی بنانے کی کوشش کیے جا رہے ہیں، حالانکہ جن سے یہ آدھے رستے پر ملنا چاہتے ہیں وہ بجائے آگے بڑھنے کے اور پیچھے ہٹتے جا رہے ہیں ـــــ کہیں "پیچھے ہٹنے" کا مفہوم "رجعت پسندی" نہ سمجھ لیجیے گا۔ یہ اصطلاح صرف مسلمانوں کے لیے وضع کی گئی ہے ـــــ اور اس فکر میں ہیں کہ جہاں تک ہوسکے اردو زبان عربی و فارسی سے بعید تر اور سنسکرت سے قریب تر ہوتی چلی جائے۔ یہ حضرات اردو کا نام "ہندوستانی" رکھ کر اپنی دانست میں یہ سمجھ رہے ہیں کہ گویا بڑی ہی دانشمندانہ چال چل گئے ہیں جس کے بعد اردو اتھوا ہندوستانی کو ہندوستان کی "قومی زبان" تسلیم کرلیا جائیگا، حالانکہ وہاں قومی زبان کا نام پہلے ہی

"ہندی اتھوا ہندوستانی" تجویز ہو چکا ہے، اور اس کو بدلنے کے لیے وہ طاقت چاہیے جو کانگریس کے ڈکٹیٹر، یعنی "جنگ آزادی" کے سالار اکبر کو حاصل ہے ـــــ غرض یہاں استدلال اور رواداری پر عمل پر بھروسہ کیا جا رہا ہے اور وہاں کام ہی دوسرا ہو رہا ہے۔

اگر آپ اس خواب غفلت میں مبتلا نہیں ہیں جس میں آپ سے پہلے اسپین کے مسلمان مبتلا ہو کر اپنا انجام دیکھ چکے ہیں تو کان کھول کر سن لیجیے کہ "قوم پرست" یہ تہیہ کر چکے ہیں کہ مسلمان کی جداگانہ ہستی ہندوستان میں نہ رہنے دی جائیگی اور اس مقصد کے لیے زبان کا بدلنا نہایت ضروری ہے۔ یہ قطعاً غلط ہے کہ اردو پر اعتراض اس کے رسم الخط کی دشواریوں کی وجہ سے ہے یا طباعت کی مشکلات اور عربی و فارسی الفاظ کی زیادتی، اور عامۃ الناس کی نافہمی کی وجہ سے ہے۔ ہرگز نہیں۔ اس پر اصلی اعتراض یہ ہے کہ وہ اپنے جداگانہ رسم الخط، اپنے ذخیرۂ الفاظ اور اپنے اسالیب بیان کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر ان کے اس امتیازی قومی وجود کا احساس زندہ رکھے ہوئے ہے جسے پنڈت جواہر لال نہرو "علیحدگی پسندی کے رجحان" سے تعبیر فرماتے ہیں۔ یہ اعتراض اگر آپ کو رفع کرنا منظور ہے تو اپنی رواداری کا ثبوت دے جائیے، اور اگر آپ اس کو رفع کرنا نہیں چاہتے ـــــ اور خدا کرے کہ ابھی تک آپ اس مقام پر نہ پہنچے ہوں ـــــ تو جتنے جلدی آپ ہوش میں آجائیں اتنا ہی بہتر ہے۔

مسلمان کو اس کی ضرورت سے زیادہ رواداری نے اکثر تباہ کیا ہے ـــــ رواداری بڑی عمدہ چیز ہے، بشرطیکہ خودکشی پر آمادہ نہ کر دے ـــــ دوسرے معاملات کی طرح زبان کے معاملہ میں بھی یہ اپنی اسی رواداری سے کام لے رہا ہے۔ ہاتھ باندھ باندھ کر منتیں کرتا چلا جا رہا ہے کہ مہاراج! ہم اردو کا نام بدلے لیتے ہیں۔ ہم اس کے رسم الخط کو بھی درست کرلیں گے۔ ہم توبہ کرتے ہیں کہ اس میں عربی فارسی کے الفاظ بھی نہیں لائیں گے۔ آپ خود دیکھ لیجیے کہ ہم ہندی کے الفاظ کس کثرت

اس زبان میں داخل کر رہے ہیں ہم آپ کے ہر برتاؤ کا سواگت کرتے ہیں کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں سارے ہندوستان کی جنتا کے سماجی سدا ہار کے لیے ہے۔ پرنتو آپ سے کیول اتنی آشا ہے کہ ہمیں اس بھاشا کو زندہ رکھنے کی آگیا دے دیجیے۔۔۔ یہ روش بڑی تباہ کن ہے۔ اس کا کوئی مفید اثر "قوم پرستوں" پر نہیں پڑ سکتا۔ ان کو آپ کی زبان کی "دشواریاں" اس کے بدلنے پر مجبور نہیں کرتیں بلکہ وہ جذبہ اندر ہی اندر کام کر رہا ہے جس کے تحت اسپین کے عیسائیوں نے مسلمانوں کی نادرۂ روزگار عمارات کے حسین و جمیل نقوش کھرچ ڈالے تھے، اس لیے نہیں کہ ان کو آرٹ سے کوئی دشمنی تھی، بلکہ صرف اس لیے کہ اسلامی خون رکھنے والی نسلوں میں ان نقوش سے اپنے ماضی کی اور اپنی قومیت کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ بالکل اسی جذبہ کے تحت زبان سے "علٰحدگی پسندی کے رجحان" کو مٹانے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں اور مسلمان سمجھ رہا ہے کہ رواداری سے کوئی بین بین راستہ پیدا ہو جائیگا۔

تم ریڑھ کی ہڈی کے بغیر محض نرم گوشت بن کر اپنی جگہ کھڑے نہیں رہ سکتے۔ اگر استقامت چاہتے ہو تو اپنے اندر ریڑھ کی ہڈی پیدا کرو۔ جب تم سے کہا جا رہا ہے کہ "اردو مسلمانوں کی زبان ہے" تو کیوں نہیں کہتے کہ ہاں صاحب! یہ ہماری زبان ہے، ہماری زبان رہے گی اور جب تک ہم موجود ہیں اسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔

داستان طویل ہوتی جا رہی ہے لیکن ابھی ایک عنوان اور بھی ہے جسے سامنے لانا ضروری سمجھتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ ہم زبان کا تحفظ چاہتے کس لیے ہیں؟ زبان بذات خود تو کوئی اہم چیز نہیں ہے۔ اس لیے محض اس کا تحفظ مقصود بالذات قرار نہیں دیا جا سکتا۔ زبان کا تحفظ ہم اس لیے چاہتے ہیں کہ اس کے ذریعہ ہمارے تمدن ہمارے کلچر کی حفاظت ہوتی ہے لیکن کیا جو کچھ آج کل عام طور پر ہماری ادبی پیداوار ہے وہ ایسی ہی ہے کہ جسے اسلامی تمدن اور اسلامی ثقافت کا آئینہ دار کہا جا سکے؟

جواب ظاہر ہے! ہمارے نوجوان لکھنے والوں میں ایک جماعت تو ایسی ہے جس نے اپنی تمام مساعی کو اس بات کے لیے وقف کر رکھا ہے کہ مذہب اور شعائر ملت کے خلاف "جہادِ عظیم" کیا جائے۔ اول تو کالجوں کی تعلیم ہی اس نہج کی رکھی گئی ہے کہ بی۔ اے کرنے تک دماغ مذہب سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر ہو جاتا ہے۔ اُس پر آزادیٔ ہند کے قائداعظم کے یہ ارشادات کہ ملک میں جس قدر مصائب موجود ہیں، ان سب کا ذمہ دار مذہب ہے، نوجوانوں کو مذہب کی مخالفت، نہیں بلکہ تضحیک و تمسخر کے لیے بالکل مسلح کر دیتے ہیں۔ پھر وہ اشتراکیت کی ایک خیالی جنت کے نشہ میں اس درجہ مدہوش و بیباک ہو جاتے ہیں کہ سوقیانہ استہزا اور بازاری تمسخر ان کے نزدیک عین معیار شرافت قرار پا جاتا ہے۔ اس پر کسی نیاز کسی جوش کی شاباش سمند ناز پر تازیانہ کا کام کرتی ہے، اور اس بدمستی میں، بقول یلدرم ان کے منہ سے بوئے فحش کے ایسے بھپکے نکلتے ہیں کہ نکیرین بھی پناہ مانگیں۔

ایک اور جماعت ہے جو جدید رومانیت کی علمبردار ہے۔ ہماری قدیم غزل گوئی کے خلاف ان کا وعظ سنیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتذال اور سوقیانہ پن کا لفظ تک سننے کے لیے یہ تیار نہیں ہیں۔ اس شاعری میں انھیں دنیا بھر کے عیب نظر آئیں گے۔ لیکن انشا رنگین جرأت جان صاحب اور رمز آشوق کو مبتذل اور فحش گو کہنے والے وزرا یہ تو دیکھیں کہ جس قسم کی عریاں فحاشی ان کے افسانوں اور (Sonates) میں آج کل ملتی ہے، اُن بیچاروں کے تصور میں بھی اس قسم کے نقشے نہ آسکتے تھے۔ وہ تو پھر ایک فرضی معشوق کی چوٹی کو ہی نمایاں کرتے تھے۔ اور آج یہ حالت ہے کہ وسیع اور مجمع عقبازی کی جاتی ہے اور نام لے لے کر واردات قلب کے مرقع تیار کیے جاتے ہیں۔ جن سے کچھ نہیں تو ذہنی تعیش اور دماغی معصیت کوشی کی لذت تو ضرور مل جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اس مغربی معاشرت کا نتیجہ ہے جو غیر محسوس طور پر ہمارے نوجوانوں کے قلب و دماغ پر چھا گئی ہے، اور جس کے تحت حیاسوز سفلی جذبات کے اظہار کا نام رومانیت رکھا جاتا ہے۔ اگر آپ کو دیکھنا ہو کہ اس رومانیت سے

یورپ کی اخلاقی زندگی پر کیا اثر پڑا ہے تو ایک اطالوی مصنف کی کتاب (The Romantic Agony) ملاحظہ فرمائیے پھر یہ بھی دیکھیے کہ اس قسم کی افسانہ نگاری اور شاعری کا اخلاق کے علاوہ نوجوانوں کی عملی زندگی پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔ ایسے نوجوان کا دماغ شروع سے ہی حقائق کی دنیا میں رہنے کے بجائے ایک افسانوی دنیا کے تصورات و تخیلات میں محو رہتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ جب دنیا کی حقیقتوں سے دوچار ہوتا ہے، تو ان کو اپنے افسانوی معیار پر پورا اُترتے نہیں دیکھتا۔ اس لیے وہ ان چیزوں سے بیزار ہو جاتا ہے، یاس و قنوطیت کا المناک حلقہ اس کے تمام اعمال و افکار پر چھا جاتا ہے۔ اور وہی نوجوان جس کی قوت عمل سے قوم کو زندہ ہونا تھا۔ خود ایک چلتا پھرتا جنازہ بن کے رہ جاتا ہے۔

ایک تیسری جماعت اور ہے اور وہ (Art for Art's sake ۔ (آرٹ محض آرٹ کی خاطر) کا قائل ہے۔ یہ اور اسی قسم کے اور جملے ایسے مہمل گورکھ دھندے ہیں جو کبھی شرمندۂ معنی نہیں ہوتے بے معنی تراکیب۔ بے مطلب فقرے۔ نثر منظوم۔ نظم منثور۔ ٹیگوری رنگ میں مجذوبوں کی سی بڑیں۔ نہ جن کا سر نہ پاؤں۔ یا تو یہ لوگ عمداً دوسروں کو بناتے ہیں یا خود بنتے ہیں۔ غالب کے تتبع میں غزلیں لکھی جاتی ہیں جن میں شوکتِ الفاظ اور ندرت ترکیبات کے زور پر سننے والوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے نمونہ ملاحظہ ہو۔

عصمت ناہید و کوثر نوبہارِ نغمہ ہے شعلۂ جوالہ ہے۔ اعتبارِ نغمہ ہے

بوئے رنگیں عنبر افشاں مرمریں رنگ شباب کیف صہبائے تمنا۔ جوئبار نغمہ ہے

یا مثلاً نثر میں پیازی اردو کہ چھلکے پر سے چھلکا اتارتے جائیے اندر سے کچھ بھی نہ نکلے :-

"ریحانہ، نور و سرور کی داستانِ شیریں، منجمد افسردہ یاسمین کا بلوریں مجسمہ، گویا قدرت کا ایک حسین خواب تھا جو رشید کی نشہ شباب میں ڈوبی ہوئی سنہری راتوں میں بہارِ صد گلستاں بدامن،

کیف زا نوائے رنگین پیدا کرتی تھی"

آرٹ سے مقصود کیا ہے۔ اس کے متعلق دورِ حاضر کے سب سے بڑے باریک بیں مبصر علامہ اقبال کی رائے قابلِ غور ہے، انہوں نے رسالہ نیو ایرا میں تحریر فرمایا ہے کہ:۔

"حیات تمام انسانی اعمال کا منتہائے مقصود ہے۔ انسانی اعمال کا مقصد صرف یہ ہے کہ اسکی زندگی شاندار، موثر اور افزوں ہو جائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ جملہ انسانی آرٹ کو اس مقصدِ عظمیٰ کے ماتحت رکھا جائے، اور جو شئے زندگی کو جس قدر فراوانی عطا کرے اسی قدر اعلیٰ و اشرف خیال کی جائے۔ بلند ترین آرٹ وہ ہے جو ہمارے اندر خفتہ قوت ارادی کو بیدار کر دے تاکہ ہم زندگی کی مشکلات کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکیں۔ وہ تمام علوم و فنون جو خواب آور ہیں، جو ہمیں گرد و پیش کے ان حقائق سے غافل کر دیں جن کی معرفت ہی پر زندگی کا انحصار ہے، وہ در اصل بربادی و موت کا پیغام ہیں۔ آرٹ وہ ہے جو ہمارے اندر بیداری کی روح پھونک دے، نہ کہ وہ جو ہم پر حالت سکرطاری کر دے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آرٹ کا منتہائے مقصود خود آرٹ ہے، وہ نادانستہ طور پر ہمیں گمراہ کرنے اور ہماری زندگی اور توانائی کو فنا کرنے کی کوشش کرتے ہیں لہٰذا از بس ضروری ہے کہ ہم ایسے نادان دوستوں سے ہوشیار رہیں۔"

اسی نظریہ کو وہ ضربِ کلیم میں ان اشعار میں بیان فرماتے ہیں:۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے — یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا!
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا — اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا!
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا!

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا !

اقبال کے متعلق کہہ دیا جاتا ہے کہ چونکہ وہ خود ایک پیغام بر ہے[1] اور اس کی شاعری یکسر پیامی ہے اس لیے اس نے آرٹ کی یہ تعریف کی ہے لیکن یہ تعریف صرف اقبال ہی کے ہاں نہیں ملتی، بلکہ معترضین کے "خدایان سخن" یعنی شعرائے مغرب بھی یہی کچھ کہتے ہیں۔ ورڈزورتھ کی شاعری کا مطمح نگاہ کسے معلوم نہیں۔ اس کا دوست کالرج (Biographia Literaria) میں لکھتا ہے کہ "کوئی شخص آج تک ایسا نہیں گذرا جو بہت بڑا شاعر ہو، لیکن اس کے ساتھ ایک مفکر اعظم بھی نہ ہو"۔ میتھو ارنلڈ لکھتا ہے کہ "ایک شاعر کی عظمت اسی میں ہے کہ وہ اپنے خیالات کا انطباق مسائل حیات سے کس طرح کرتا ہے اور اس سوال کا حل کیا پیش کرتا ہے کہ زندگی کیسے بسر کی جائے"۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ شاعر جب پیغامبر یا مصلح ہو جاتا ہے تو اس کی شاعری میں فنی لطافتیں، ادبی نفاستیں حسن ترنم، اور طرفگی انداز و بیان باقی نہیں رہتا۔ اول تو یہ کلیہ غلط ہے۔ ہمارے سامنے دور حاضر کا سب سے بڑا شاعر، اقبال موجود ہے۔ جو درحقیقت ایک بالغ نظر مفکر اور بلند پایہ پیغامبر ہے لیکن بایں ہمہ اُس کے کلام میں ادبی لطافتیں اس حسن و خوبی سے موجود ہیں کہ باید و شائد۔ لیکن اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ کلام کے پیامی ہونے سے اس میں ادبی خوبیاں کم ہو جاتی ہیں تو یہ ایک ایسی کمی ہے جس کی قیمت بہت زیادہ وصول ہو جاتی ہے۔ آرٹ کے متعلق جب نظریہ صحیح ہو جائے تو پھر دیکھیے کہ کونسا ادب اور کونسی شاعری آپ کو حیات بخش نظر آتی ہے، اور کونسی محض تفنن طبع اور کونسی غارت گر حیات؟ اسی نظریہ کا فرق ہے کہ ایک طرف حقائق کی جستجو کرنے والوں نے اقبال کے کلام سے نئی زندگیوں کی تعمیر کر لی، اور دوسری طرف آگرہ اور لکھنؤ ہنوز اسی الجھن میں گرفتار ہیں کہ اسنے

---

[1] پیغمبر کے مفہوم سے جدا کرنے کے لیے یہ طریق املا اختیار کیا گیا ہے۔

بلبل کو مذکر باندھا ہے یا مونث، اور نہ معلوم ابھی کب تک اس تحقیق عظیم کا سلسلہ جاری رہے گا کہ بلبل فی الواقع مونث ہے یا مذکر؟

مقصد اس طویل داستان سے یہ ہے کہ جب ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں تو ہماری زندگی کا نصب العین بھی تو اسلامی ہونا چاہیے۔ بالخصوص ایسے وقت میں جب کہ ہم محسوس کر رہے ہیں کہ ہماری قومیت اور تہذیب کو فی الواقع ایک عظیم الشان خطرہ کا سامنا ہے۔ یہ وقت وہ ہے کہ جو کچھ جس کے بس میں ہو اس متاعِ گرانمایہ کی حفاظت کے لیے کر گزرے۔ یہی ہماری زندگی کا نصب العین ہونا چاہیے۔ طریق کار خواہ کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں، ہماری تمام جدوجہد کا رخ اسی ایک نصب العین کی طرف ہونا چاہیے۔ ادیب اپنے ادب سے، شاعر اپنے شعر سے، افسانہ نگار اپنے افسانوں سے، رسائل اپنے صفحات سے، خریدار اپنے ذوقِ ادب و شعر سے، غرض ہر مسلمان اپنے اپنے دائرۂ امکان میں اپنی ہر کوشش اسی مقصد کے حصول میں صرف کردے۔ ہمارے رسائل میں "مذہبی" اور "ادبی" کی تفریق دراصل اُس تفریق پر مبنی ہے جو کلیسا اور سلطنت کی تفریق سے پیدا ہوتی ہے، اور جو یکسر غیر اسلامی تفریق ہے۔ ہمارے ہر پرچہ کو اسلامی ہونا چاہیے، اور اس کی ادبی و صحافتی خدمات اسی عنوان کی تفسیرات ہونی چاہئیں۔ ادب پسند حضرات کو بھی اس تبدیلی نصب العین سے قطعاً نہیں گھبرانا چاہیے کیونکہ "اسلامیات" اور "مولویات" میں درحقیقت بہت نمایاں فرق ہے۔ لیکن آج کل تو ہمارے ہاں یہ حال ہو رہا ہے کہ کوئی پرچہ جو اپنی پیشانی پر "علمی و ادبی مجلّہ" کا عنوان لکھ لیتا ہے، اسلام اور مسلم کا لفظ بھی اس کے اندر لکھنا کفر سمجھتا ہے۔ میں ادب و شعر کی اہمیت کو کم نہیں کرنا چاہتا لیکن کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ادب و شعر ہماری عمارتِ ملی کی جڑ نہیں ہیں، محض تزئین و آرائش کی چیزیں ہیں۔ جب کسی عمارت کی بنیادیں ہی خطرہ میں ہوں تو کوئی صاحبِ دانش و بینش اس وقت اپنی کوششیں

اس کی تحسین و تزئین میں صرف نہیں کرتا بلکہ سب سے مقدم کام خود عمارت کے استحکام کو سمجھتا ہے۔
میں محسوس کرتا ہوں کہ جب ہم اس تبدیلی کا اعلان کریں گے۔ تو اطراف و جوانب سے ہم پر انگلیاں اٹھیں گی لیکن بقول مولانا حالی "دلفریب مگر نکمی باتوں پر آفرین سننے سے دل شکن مگر کام کی باتوں پر نفرین سننی بہتر ہے۔"

آپ نے دیکھ لیا کہ اس "تحریک آزادی" میں آپ کے لیے کیسی کیسی خوبصورت "زنجیریں" تیار ہو رہی ہیں۔ اگر آپ سمجھنا چاہتے ہیں کہ یہ زنجیریں کیا کریں گی، تو ہندوستان کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالیے یہاں یونانی آئے، پارتھین آئے، باخترین آئے، ہن آئے، اور متعدد قومیں یکے بعد دیگرے آئیں لیکن آج ذرا چراغ لے کر ڈھونڈ تو سہی کہ ان قوموں کا کہیں سراغ بھی مل رہا ہے؟ یہ کہیں باہر تو واپس چلی نہیں گئیں۔ پھر آخر کیا ہوئیں کیوں نظر نہیں آتیں؟ اس کا جواب تاریخ یہ دیتی ہے کہ انہوں نے خود فراموشی کا جرم کیا تھا اس لیے فنا ہو گئیں۔ جب یہ ہندوستان آئی تھیں تو اپنی الگ زبان الگ تہذیب الگ تمدن، الگ مذہب رکھتی تھیں۔ مگر انہوں نے اپنے امتیازی وجود کی حفاظت نہ کی اپنے آپ کو اس ملک کی عام آبادی میں محو کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج دنیا میں انکا نام و نشان تک باقی نہیں ہے۔ صرف افسانے رہ گئے۔ اب کیا آپ بھی یہی چاہتے ہیں کہ آپ کے بجائے صرف آپ کے افسانے باقی رہ جائیں؟
ہو سکتا ہے کہ ہم اس آنے والے سیلاب کا پوری طرح مقابلہ نہ کر سکیں۔ "لیکن جب اس کا مقابلہ کرتے کرتے ہمارے ہاتھ شل ہو جائیں گے، ہمارے بازوؤں میں قوت نہ رہے گی، جب ہمیں موجوں کے تھپیڑے بالکل نیم مردہ کر کے ساحل کی ریت پر پھینک دیں گے تو اس آخری وقت میں کم از کم اتنا اطمینان تو ضرور ہو گا کہ بزدلی کی زندگی جینے سے یہ مردانگی کی موت ہزار درجہ بہتر ہے۔"

دارالاسلام

(اسی اشاعت میں صفحہ اول پر یہ اعلان ناظرین کے ملاحظہ سے گزر چکا ہے کہ دفتر ترجمان القرآن ماہ ذی القعدہ میں "دارالاسلام" کی طرف منتقل ہو رہا ہے ۔۔ اس کو دیکھ کر فطرۃً آپ کے دل میں سوال پیدا ہوگا کہ یہ دارالاسلام کیا چیز ہے؟ ذیل کا مضمون اسی سوال کا جواب ہے)

مقام | پنجاب کے ضلع گورداسپور میں پٹھانکوٹ ایک مشہور قصبہ ہے۔ اس سے چند ہی میل کے فاصلہ پر کوہستان ہمالیہ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، اور اس کے قریب ہی وہ مقام واقع ہے جہاں سے دریائے راوی پہاڑوں کی آغوش سے نکل کر پنجاب کے میدانی علاقہ میں آتا ہے۔ مناظر کے لحاظ سے یہ علاقہ بہت فرحت بخش ہے۔ آب و ہوا اچھی ہے۔ زمین زرخیز ہے۔ پانی کی افراط ہے۔ قدرت نے میلوں تک جنگلوں کو باغ بنا رکھا ہے۔

اسی علاقہ میں پٹھان کوٹ سے چار میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا گاؤں جمال پور واقع ہے جہاں چند بندگان خدا نے "دارالاسلام" کی بنا رکھنے کا ارادہ کیا ہے۔ اس غرض کے لیے ساٹھ ستر ایکڑ زمین حاصل کر لی گئی ہے جو راہ خدا میں وقف ہے۔ ایک مسجد، ایک کتب خانہ کی عمارت، ایک دارالاقامہ (جو بیس پچیس آدمیوں کے لیے کافی ہو سکتا ہے) اور دو مکان تعمیر کر لیے گئے ہیں سردست کام کی ابتدا کرنے کے لیے اتنی عمارتیں کافی ہیں۔ زمین وقف میں اتنی گنجائش ہے کہ آئندہ جیسی ضروریات پیش آئیں ان کے مطابق جدید عمارتیں بنا لی جائیں۔ نیز اطراف و اکناف میں پھیلنے کے لیے بھی بہت کافی جگہ موجود ہے اور وقف کی زمین اتنی زرخیز و شاداب ہے کہ اگر اسے صحیح طریقہ پر استعمال کیا جائے تو پانچ چھ ہزار روپیہ سالانہ آمدنی دے سکتی ہے۔ یہ ان ابتدائی کاموں کے لیے کافی ہے جو

پیش نظر ہیں۔ شہری آبادیوں سے یہ جگہ دور بھی ہے اور یہاں وہ آسانیاں بھی بہم پہونچ سکتی ہیں جو شہری زندگی کے لیے درکار ہیں۔ ریلوے اسٹیشن سرنا (جو امرتسر پٹھان کوٹ لائن پر واقع ہے) یہاں سے صرف دس منٹ کی مسافت پر ہے۔ قریب ہی سے برق آبی (ہائیڈرو الکٹرک سسٹم) کا سلسلہ گذرا ہے جس سے ضرورت کے وقت نہایت سستی بجلی حاصل کی جا سکتی ہے۔ دوسری طرف ایک بہت بڑی نہر (جس میں پورا دریائے راوی منتقل کر دیا گیا ہے) زمین وقف سے متصل ہو کر ہی گزری ہے۔ اور یہ پانی حاصل کرنے کا ایسا ذریعہ ہے جو تمام ضروریات کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔ غرض یہاں ترقی کے امکانات غیر محدود ہیں، اور اس کے ساتھ یہ مقام شہری آبادیوں سے اتنی دور ہے کہ ہم کو ایک آزاد ماحول میسر آسکتا ہے جس میں ہم اپنی دنیا الگ بنا سکتے ہیں۔

مقصد اس الگ تھلگ، باہمہ و بے ہمہ مقام پر جس تخیل کو ہم عملی جامہ پہنانا چاہتے ہیں اس کے لیے "دارالاسلام" کے سوا اور کوئی نام جامع و مانع نہیں ہو سکتا۔ صرف یہی ایک نام ہے جو اس کے تمام حدود پر حاوی ہو سکتا ہے۔ اصطلاح فقہی سے قطع نظر کیجیے کہ اس کے لحاظ سے تو دارالاسلام صرف اس جگہ کو کہیں گے جہاں اسلامی حکومت ہو اور اسلامی قانون بغیر کسی منع و مزاحمت کے پوری طرح نافذ ہو۔ بدقسمتی سے اس وقت ہندوستان میں ایسی کوئی جگہ تو ہم کو میسر نہیں آسکتی۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اس وقت جیسے کچھ حالات بھی ہندوستان کے ہیں، انہی میں کم از کم زمین کا ایک گوشہ ایسا بہم پہونچایا جائے جہاں خالص اسلامی ماحول پیدا کیا جا سکے۔ جہاں اخلاق اسلامی ہوں، معاشرت اسلامی ہو، عملی زندگی مسلمانوں کی سی ہو، گرد و پیش ہر طرف اسلام اپنی روح اور اپنی صورت کے ساتھ نمایاں ہو۔ جہاں کسی چیز کے صحیح ہونے کے لیے صرف یہ دلیل کافی ہو کہ خدا اور رسول نے اس کا حکم دیا ہے یا اس کی اجازت دی ہے، اور کسی چیز کا غلط ہونا صرف اس دلیل سے تسلیم کیا جائے کہ خدا اور اس کے رسول نے اس سے منع کیا ہے یا اس کو ناپسند کیا ہے۔ جہاں یہ بغاوت اور سرکشی کا ماحول